© rasailojaraid.com

تعمیرِ خودی (۱)

مدثر رشید

قدیم زمانے کی بات ہے کہ بہت سی بھیڑ بکریاں کسی چراگاہ میں رہتی تھیں۔ ایک دن چند شیر کسی جنگل سے یہاں آ نکلے اور انہوں نے بھیڑوں پر حملہ کر دیا' اور دیکھتے ہی دیکھتے چراگاہ بھیڑوں کے خون سے سرخ ہوگئی۔ اس دوران کہ شیر بھیڑوں کی چیر پھاڑ میں مصروف تھے' ان میں سے ایک دانا' سمجھ دار اور ادھیڑ عمر بھیڑ نے شیروں کو مخاطب کر کے وعظ شروع کیا۔ اس نے ان سے کہا کہ دیکھو میں خدا کی طرف سے خاص روحانی قوت سے مالا مال ہوں۔ میں تمہیں یہ نصیحت کرتی ہوں کہ اپنے برے کاموں سے توبہ کرو' جو بھی غصیلہ اور طاقت کے نشے میں چور ہے وہ بد بخت ہے۔ دانتوں کی تیزی تمہیں رسوا کر رہی ہے۔ شان و شوکت اور ہیبت اور دبدبے کی خواہش تو نرا فساد ہے۔ تم جو بھیڑ بکری کو مار کر فخر کرتے ہو' اگر بلندی کا درجہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو مارو! جو گوشت کھانا چھوڑ دے وہ خدا کا مقبول بن جاتا ہے اور نیک روحیں گھاس پات کھا کر ہی گزارا کرتی ہیں۔ شیر جو پہلے ہی لگاتار جدوجہد اور محنت اور مشقت سے تھک چکے تھے' ان کو جدوجہد سے بیگانہ کر دینے والی یہ نصیحت پسند آ گئی۔ چنانچہ انہوں نے جو کبھی بھیڑوں کا شکار کیا کرتے تھے خود بھیڑوں کی سی خصلت اپنا لی۔ بس پھر کیا تھا' رفتہ رفتہ شیروں کو' جو گوشت کے عادی تھے' گھاس مزہ دینے لگی۔ پھر کافی عرصہ گھاس کھانے کی وجہ سے دانتوں کی وہ پہلی سی کاٹ بھی جاتی رہی۔ شعلہ بکھیرنے والی آنکھوں کی وہ پہلی سی ہیبت بھی نہ رہی۔ دل سے جرأت اور دلیری بھی آہستہ آہستہ رخصت ہوگئی۔ فولادی مضبوط پنجوں میں کمزوری آ گئی اور جسموں کی قوت و طاقت بھی گھٹ گئی۔ جان کا خوف بڑھ گیا اور اس کے نتیجے میں ہمت اور دلیری بھی ختم ہوگئی۔ غرضیکہ شیر اب دیکھنے میں تو شیر تھے لیکن حقیقتاً وہ بھیڑ بن چکے تھے۔ یا دوسرے معنوں میں وہ اب اپنی اصل سے غافل ہو چکے تھے۔ یہ قصہ علامہ اقبال نے اپنی مشہور مثنوی 'اسرارِ خودی' میں بیان کیا ہے' جو ان کے تصورِ خودی کی ایسی سادہ اور آسان تشریحات سے بھری پڑی ہے۔ علامہ کے نزدیک ہر چیز کی ایک اصل ہے' جب تک وہ اس پر قائم رہتی ہے اس کا وجود برقرار رہتا ہے اور جیسے ہی وہ اس سے غافل ہوتی ہے اپنا وجود بھی کھو دیتی ہے۔ گویا وجود درحقیقت اسی جوہرِ خودی کی نمود ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود　　مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا!
وجود کیا ہے؟ فقط جوہرِ خودی کی نمود　　کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا!

اس حقیقتِ خودی کو انہوں نے مثنویِ اسرارِ خودی میں مختلف انداز میں واضح کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

کوہ چوں از خود رود' صحرا شود　　شکوہ سنجِ جوشش دریا شود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

[پہاڑ جب اپنی ذات یا خودی سے غافل ہو جاتا ہے تو وہ بکھر کر صحرا کی صورت اختیار کر جاتا ہے اور سمندر کے طوفان کی شکایت کرنے لگتا ہے۔]

موج تا موج است در آغوشِ بحر — می کند خود را سوارِ دوشِ بحر

[موج جب تک آغوشِ بحر میں موج کی صورت ہے سمندر کے اندر ہے (یعنی وہ اپنی خودی سے باخبر ہے) وہ اپنے آپ کو سمندر کے کندھوں پر سوار رکھتی ہے۔]

خودی کی یہ شاید سب سے آسان تشریح ہے جو علامہ نے اس مثنوی میں خود بیان کی ہے۔ گو پہاڑ ہو یا موج، دریا ہو یا سمندر، غرضیکہ اس کائنات میں جتنی بھی مخلوقات ہیں ہر کسی کی ایک اصل، ایک خودی ہے، اور اس کی بقاء کا دار و مدار اس خودی کے استحکام پر ہی ہے، ورنہ فنا اس کا مقدر ہے۔ اب یہیں سے ایک اور سادہ سا سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسان کی وہ اصل کیا ہے جس پر اس کا وجود منحصر ہے؟ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو اسرارِ خودی کو آشکارا کرنے کے لیے ایک کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کی اصل کیا ہے، اس پر تو شاید ہی کوئی دور ایسا گزرا ہو جس میں وقت کے اہلِ علم و بصیرت نے غور کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا ذکر کسی نہ کسی صورت میں مشرق و مغرب کے ہر دور کے لٹریچر میں مل جاتا ہے۔ لیکن جو چیز اقبال کے تصورِ خودی کو ان دیگر تصورات سے ممیّز کرتی ہے وہ ان کا انسانِ مطلوب یعنی مردِ مؤمن کا تصور ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ رامائن و مہا بھارت اور اسلامی تصوف کا 'مردِ کامل'، کارلائل کا 'ہیرو'، شوپن ہائر کا 'جینئس'، نیٹشے کا 'فوق البشر (Superman)'، گوئٹے کا تصورِ انسان (جو ایکرمین (Eckermann) کے توسط سے سامنے آتا ہے) اور ان جیسے دیگر تصوراتِ انسانی خودی کی ہی دیگر تشریحات ہیں۔ جب ہم انسان کی ہمہ گیر شخصیت اور اس کی بے پناہ صلاحیتوں، جن کی حامل کائنات کی کوئی اور مخلوق نہیں، کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس امر کا اندازہ بھی بآسانی ہو جاتا ہے کہ انسان کی حقیقت یا اس کی خودی کو سمجھنا اتنا آسان نہیں۔ بنی نوع انسان نے آج تک جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں وہ سب اس خودی کی صلاحیتوں کی نمود ہے، اور جن جن نے یہ کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں وہ انسانِ مطلوب قرار پائے جانے کے مستحق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اٹیلا، چنگیز، نپولین، ہٹلر وغیرہ کی شخصیات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ان میں نیٹشے کا فوق البشر دکھائی دیتا ہے، جب ہم ارسطو، افلاطون، آئن سٹائن، نیوٹن وغیرہ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں شوپن ہائر کا جینئس دکھائی دیتا ہے اور جب ہم عبدالقادر جیلانی، بایزید بسطامی، جنید بغدادی، مولانا روم وغیرہم کو دیکھتے ہیں تو ہمیں انسانِ کامل نظر آتا ہے۔ غرضیکہ ہر کسی نے ایسے رجالِ عظام میں سے کسی کو اپنا مطلوب سمجھا اور اسی پر اپنے نظریۂ خودی کو استوار کر دیا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو علامہ اقبال نے جس ہستی کو انسانِ مطلوب قرار دیا اس کی جھلک انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کے سچے متبعین کی شخصیات میں ملتی ہے اور جس کا کامل اور اکمل مجسمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے جو دراصل تمام اوصافِ حسنہ کے جامع ہیں۔ وہ ایسے فاتح اور حاکم تھے جنہوں نے ایک عظیم حکومت اور تہذیب کی بنیاد ڈالی، ان کا مجموعۂ حدیث علم و حکمت کے موتیوں سے بھرا پڑا ہے اور ان کی خدا خوفی، للّٰہیت، اور انسان دوستی کا کوئی ثانی پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتا۔ یہ ان صفات کی جامعیت ہی تھی کہ جس بنا پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عظمت کا اعتراف غیر مسلم بھی کرنے پر مجبور ہیں۔

اقبال کے انسانِ مطلوب کی اس جامعیت ہی کا مظہر تھا کہ ان کا فلسفہ خودی ایک جامع فلسفے کے طور پر تشکیل پایا اور جیسا کہ شروع میں بیان ہوا یہی وہ کلیدی نکتہ تھا جو قرآن میں تدبر سے ان پر منکشف ہوا۔ اصل میں یہ وہ حقیقت ہے جس تک انسان اپنی عقل کے ذریعے نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے وہ ایک خاص قسم کے علم یعنی علمِ وحی کا محتاج ہے' جو اس کائنات کے خالق اور رب نے اپنے مخصوص بندوں کے ذریعے بنی نوع انسان تک پہنچایا۔ علامہ اقبال خود مسلمان تھے اور قرآن وحی کی کامل صورت میں ان کے پاس موجود تھا۔ پھر ان کا اس سے والہانہ لگاؤ اور اللہ کی طرف سے عطا کی ہوئی روحانی بصیرت وہ سب عوامل تھے جنہوں نے ان کے لیے اس بنیادی مسئلہ کا حل آسان بنا دیا۔ چنانچہ شارحینِ اقبال اس پر متفق ہیں کہ علامہ اقبال کے نزدیک انسان کی اصل یعنی خودی بندۂ مؤمن ہے' جس کی معراج محمد عربی ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے۔ اگر چہ علامہ اقبال سے پہلے شیخ احمد سرہندی' مولانا روم اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے عظیم مسلمان مجددین کرام نے بھی اس حقیقت کو سمجھا' لیکن علامہ اقبال کو کیونکہ ایسا دور ملا تھا جب مغرب میں احیاء العلوم کی تحریک زور وشور سے جاری تھی اور کائنات' خدا اور انسان کے بارے میں نت نئے تصورات اور فلسفے وجود میں آ رہے تھے اور قدیم پیچیدہ مسائل ٹھوس علمی حقائق کی روشنی میں حل ہوتے جا رہے تھے' ان کو اپنے اس صحیح اسلامی تصور کو جس کا ماخذ وحی الٰہی تھا اس دور کی اعلیٰ علمی سطح پر ٹھوس عقلی دلائل کے ساتھ پیش کرنے کا موقع مل گیا۔ پھر شاعری کے خوبصورت اور دلکش اندازِ بیان نے اس کو وسیع حلقے میں متعارف کرانے میں بے حد مدد دی۔ چنانچہ اقبال کا تصورِ خودی کوئی نیا تصور نہیں ہے بلکہ اس ضمن میں پہلے سے موجود تصورات کی اسلامی نکتہ نگاہ سے ایک مفصل اور مدلل تشریح ہے۔ لیکن ایک بات جو ان کے کلام سے روزِ روشن کی طرح واضح ہے وہ یہ کہ ان کے اصل مآخذ جن سے انہوں نے اپنے افکار اخذ کیے' قرآن وسنت تھے نہ کہ مغربی فلاسفہ کے افکار ونظریات' جن کو پیش کرنے سے ان کا مقصد وقت کے اعلیٰ علمی ذہن تک اپنا پیغام پہنچانے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے کلام میں وہ کہیں بھی ان مغربی حکماء سے متاثر نظر نہیں آتے جیسا کہ بعض معترضین الزام لگاتے ہیں' بلکہ اس کے برعکس وہ ان کے نظریات کے غلط پہلوؤں پر تنقید کرتے ہی نظر آتے ہیں۔ مثلاً فرماتے ہیں:

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا — زُنّاریٔ برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی — ہے اس کا طلسم سب خیالی!
انجامِ خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفہ زندگی سے دوری!

ایک اور جگہ نیٹشے کے بارے میں فرماتے ہیں:

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں — تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے!

یہاں ایک اور وضاحت بھی ضروری ہے کہ جب تحریر کے آغاز میں خودی کی سادہ اور آسان تشریح کی بات کی گئی تھی تو اس سے مراد تصورِ خودی کی تشریح تھی نہ کہ فلسفہ خودی کی۔ فلسفہ خودی دراصل وہ جامع فلسفہ ہے جس کی بنیادیں علامہ اقبال نے اپنے تصورِ خودی پر استوار کیں۔ فلسفہ خودی کو سمجھنا یقیناً اتنا آسان نہیں اور نہ ہی اس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی آسان تشریح ہو سکتی ہے۔ اس فلسفے کا بنیادی تصور کیونکہ اللہ ربّ العزت کے عطا کردہ علم وحی پر ہونے کی وجہ سے صحیح ہے' اس کی تشکیل بھی صحیح طرز پر ہو سکتی ہے' جو اسے ان تمام فلسفوں پر فوقیت دے سکتی ہے جو تمام تر علمی و عقلی حقائق سے مرصّع ہونے کے باوجود غلط تصورات پر استوار ہونے کی وجہ سے غلط قرار پائے جا چکے ہیں یا پائے جا رہے ہیں۔ شارحینِ اقبال کے نزدیک یہ واحد فلسفہ ہے جو کائنات' خدا اور انسان کو ایک مربوط انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اثرات فلسفۂ انسان و کائنات' فلسفۂ سیاست' فلسفۂ قانون' فلسفۂ تعلیم' فلسفۂ اخلاق' فلسفۂ اقتصادیات' فلسفۂ تاریخ' فلسفۂ ہنر' فلسفۂ نفسیات وغیرہم سب پر کسی نہ کسی صورت میں پڑتے ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم' جو اقبال کے ایک مستند شارح ہیں' اپنی کتاب 'حکمتِ اقبال' کے دیباچے میں تصورِ خودی اور فلسفۂ خودی کے درمیان اس فرق کو یوں واضح کرتے ہیں:

> ''عرصۂ دراز تک اقبال کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اقبال کے تصورات علمی اور عقلی اعتبار سے نہایت برجستہ' زوردار' درست اور ناقابل تردید ہیں اور اگرچہ یہ تصورات اس کی نظم اور نثر کی کتابوں میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں تاہم ان میں ایک عقلی اور ایک علمی ربط موجود ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب صرف ایک تصور سے ماخوذ ہیں جسے اقبال خودی کا تصور کہتا ہے۔ لہٰذا اقبال کی تشریح کا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ خودی کے مرکزی تصور کے ساتھ اس کے دوسرے تمام تصورات کے علمی اور عقلی ربط کو واضح کیا جائے۔ اور اگر ایسا کرنے کے بغیر اس کی کوئی تشریح کی جائے گی تو وہ مسلمانوں کے لیے بالعموم اور غیر مسلموں کے لیے بالخصوص پوری طرح سے قابل فہم اور تسلی بخش نہیں ہو سکے گی۔ دراصل اس وقت بھی اقبال کے خیالات کے متعلق جس قدر غلط فہمیاں مسلمانوں اور غیر مسلموں میں پائی جاتی ہیں اس کا سبب یہی ہے کہ اقبال کے خیالات کی علمی اور عقلی ترتیب اور تنظیم مہیا نہیں کی گئی۔ دوسرے الفاظ میں میرا نتیجہ یہ تھا کہ اقبال کا فلسفہ دنیا کے اور بڑے بڑے فلسفوں کی طرح بالقوّہ انسان اور کائنات کا ایک مکمل اور مسلسل فلسفہ ہے جس کا امتیازی وصف یہ ہوتا ہے کہ اس کے تصورات میں ایک عقلی یا منطقی ترتیب موجود ہوتی ہے جو اسے مؤثر اور یقین افروز بناتی ہے۔ اور اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اقبال کے تصورات کی مخفی عقلی ترتیب اور تنظیم کو آشکار کر کے اس کے فکر کو ایک مکمل نظامِ حکمت (Philosophical System) کی شکل دی جائی تاکہ وہ نہ صرف پاکستان کے اندر پوری طرح قابل فہم بن جائے بلکہ دنیا کے آخری باطل شکن عالمگیر فلسفے کی حیثیت سے دنیا کے علمی حلقوں میں اپنا مقام حاصل کر سکے۔''

جہاں تک فلسفہ خودی کی بات ہے تو وہ آگے چل کر اس کو ''مستقبل کا فلسفہ'' اور یہاں تک کہ ''کائنات کا آخری فلسفہ'' قرار دیتے ہیں:

> ''حکمتِ اقبال کی یہی وہ خصوصیات ہیں جو اسے کائنات کا وہ آخری فلسفہ بنا دیتی ہیں جو ہر دور کے باطل فلسفوں کا مسکت اور تسلی بخش جواب ہو۔ شاہ ولی اللہ اور محی الدین ابن عربی کے زمانہ میں اس قسم کے فلسفہ کا وجود میں آنا ممکن نہیں تھا۔ آج اگر مسلمان یا کوئی اور قوم جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کا معقول علمی جواب دینا چاہے' جسے دورِ حاضر کا انسان بھی سمجھ سکے' تو وہ صرف اقبال کے نظامِ حکمت سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی پیدا کیا جا سکتا ہے‘ کسی اور فلسفہ سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ انسان اور کائنات کی سچی حقیقت کو سمجھنے کے لیے جس قسم کی ذہنی رکاوٹیں کسی زمانہ میں پیدا ہوتی ہیں قدرت ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے علاج بھی ویسا ہی کرتی ہے۔ اقبال کا فلسفہ خودی اپنے مزاج کے لحاظ سے اپنے دور کے فلسفوں کی تمام ظاہری خصوصیات سے حصہ لیتا ہے تا کہ ان کا تسلی بخش جواب بن سکے۔‘‘(۱)

چنانچہ فلسفہ خودی پر انہوں نے ایک شہرۂ آفاق تصنیف ’آئیڈیالوجی آف دی فیوچر‘ لکھی جس کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی ۔لیکن اس پر تو ابھی بہت کام کرنا باقی ہے اور ابھی تک جو کام بھی ہوا ہے اس کی حیثیت ابتدائی نوعیت کی ہے۔ بہر حال اس تحریر کا مقصد فلسفہ خودی کو تفصیلاً پیش کرنا نہیں ہے‘ جس پر ان شاء اللہ پھر کبھی بات ہو گی‘ بلکہ اس کا مقصد تصورِ خودی کے اس پہلو کو واضح کرنا ہے جو عملی بھی ہے اور انقلابی بھی‘ جسے اقبال تعمیرِ خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے لیے علامہ نے تربیتِ خودی‘ استحکامِ خودی اور تشکیلِ خودی کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ سادہ الفاظ میں یہ وہ انقلابی تصور ہے جس کا مقصد ان شیروں کو پھر سے اپنی خودی حاصل کرنے کا طریق بتانا ہے جو بھیڑ کی نصیحت پر عمل پیرا ہو کر اسے کھو بیٹھے ہیں۔ علامہ کے نزدیک یقین‘ عمل پیہم‘ عشق‘ فقر‘ خودداری‘ حق گوئی و بے باکی وغیرہ وہ صفات ہیں جن کو اپنانے سے خودی مستحکم ہوتی ہے۔ جہاں تک اس سلوک کا تعلق ہے جس کے ذریعے انسان اپنی خودی کی تربیت کر سکتا ہے علامہ نے مربوط شکل میں صرف چند مقامات پر ہی بیان کیا ہے۔ جیسا کہ ’اسرارِ خودی‘ میں ایک مقام پر علامہ تربیتِ خودی کے تین مراحل بیان کرتے ہیں: اطاعت‘ ضبطِ نفس اور پھر نیابت الٰہی۔ لیکن اگر ان کے کُل کلام پر غور کیا جائے تو اس سلوک کو انہوں نے بہت وضاحت سے پیش کیا ہے جس میں ان مراحل کے علاوہ اور مراحل کا ذکر بھی ملتا ہے‘ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ مربوط شکل میں نہیں ہیں۔ اس کی وجہ جیسا کہ پہلے بیان ہوئی یہی ہے کہ علامہ نے اپنے افکار کا اظہار شاعری کے ذریعے سے کیا ہے‘ جس میں ربط قائم رکھنا ممکن نہیں ہوتا‘ کیونکہ ایسا کرنے سے شاعری کا حسن برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عظیم شعراء کے شارحین ہوتے ہیں جو ان کے افکار کو ایک نظم اور ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاہم ان شارحین میں وہی شاعر کے تصورات کو واضح کر پاتے ہیں جو اس کے طبعی میلانات اور ماخذات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ورنہ ایسا ہوتا ہے کہ شارحین شعراء کے کلام میں موجود اجمال سے فائدہ اٹھا کر تشریح کی آڑ میں اپنے نظریات پیش کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس تحریر کا مقصد غیر جانبدار ہو کر علامہ اقبال کے کلام کی روشنی میں تعمیرِ خودی کے سلوک کو ایک مربوط شکل میں پیش کرنا ہے تا کہ اس انقلابی تصور کے ذریعے موجودہ دور کے لیے عملی راہنمائی حاصل کی جا سکے۔

تعمیرِ خودی کے اس سلوک کے ضمن میں علامہ نے صرف مراحل ہی بیان نہیں کیے بلکہ ان ذرائع کی نشاندہی بھی کی ہے جن کے ذریعے انسان ان مراحل کو عبور کر سکتا ہے اور یہی ان کے کلام کا امتیاز ہے۔ یقین‘ عمل پیہم‘ عشق‘ فقر‘ خودداری‘ حق گوئی و بے باکی وغیرہ جن صفات کو اپنانے کی تلقین اقبال کرتے ہیں‘ یہ تو ہمیشہ سے معلوم ہیں۔ لیکن ان صفات کو کیسے اپنایا جا سکتا ہے‘ اس پر شاید اس تفصیل سے بات کسی کے ہاں نہیں ملتی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۔ سلوکِ تعمیرِ خودی

ذیل میں تفصیلاً سلوکِ تعمیرِ خودی کے دیگر مراحل بیان کیے جارہے ہیں:

پہلا مرحلہ: مقصد کا تعین: علامہ اقبال کے نزدیک وہ شخص جس کا مقصد صرف ضروریاتِ زندگی کا حصول، نفس پرستی اور شہوت رانی ہی ہے تو ایسا شخص اپنی خودی کی تعمیر نہیں کرسکتا، بلکہ اس کی حیثیت جانور سے زیادہ نہیں ہے، کیونکہ ان کا مقصد بھی نفس پرستی اور شہوت رانی ہے۔

مثلِ حیواں خوردن آسودن چہ سود؟ گر بخود محکم نۂ بودن چہ سود؟

[حیوانوں کی مانند محض کھانے اور آرام کر لینے کا کیا فائدہ؟ اور اگر تو اپنے آپ میں توانا نہیں تو زندگی کا کیا فائدہ؟]

جو شخص اپنی ذات سے بلند ہو کر کسی اعلیٰ مقصد کو پانے کی کوشش کرتا ہے تو یہیں سے اس کی خودی کی تعمیر شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال کے نزدیک سلوکِ تعمیرِ خودی کا سب سے پہلا مرحلہ ایک بلند مقصد کا تعین ہے۔ یہ دراصل انسان کی فطرت ہے کہ اگر وہ کوئی بھی کام سرانجام دینا چاہتا ہے تو پہلے اس کو اپنا مقصد بناتا ہے۔ اگر اس کام کی تکمیل اس کا مقصد نہ ہو تو وہ کبھی بھی اس کے لیے عمل پیرا نہیں ہو پاتا۔ علامہ کا انسانِ مطلوب چونکہ قرآن کا بندۂ مؤمن ہے، چنانچہ وہ مقصد کا تعین بھی قرآن کی روشنی میں ہی کرتے ہیں۔ خود اسلامی لٹریچر میں جہاں کہیں انسانِ مطلوب حضور ﷺ کو ہی سمجھا گیا ہے وہاں بھی مقصد کے صحیح تعین میں غلطی ہوئی ہے۔ اصل مسئلہ یہی ہے کہ انسان کی اس حقیقت تک رسائی علمِ وحی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس مقصد کے صحیح تعین میں سب سے بڑی رکاوٹ خود انسان کی اپنی ماہیت ہے۔ آسمانی کتابوں کی تعلیمات کے مطابق انسان روح و بدن کا مرکب ہے۔ لیکن مغرب نے چونکہ بدترین پاپائیت (Theocracy) سے چھٹکارا حاصل کیا تھا جس کی وجہ سے وہ ایک طویل عرصے تک دورِ جاہلیت میں رہے، چنانچہ مغرب میں اس کے ردِعمل میں جو تحریک احیاء العلوم شروع ہوئی، اس میں دین سے بیزاری کا عنصر غالب تھا۔ چنانچہ اس کے بعد جو بھی نظریات اور فلسفے سامنے آئے، ان میں انسان کے بدن کو ہی اصل اہمیت حاصل رہی، جبکہ روح، جو مذہبی تعلیمات کا اصل محور ہے، کو سراسر فراموش کر دیا گیا۔ چنانچہ نیٹشے جس کا تصورِ فوق البشر اقبال کے تصورِ مردِ مؤمن کے کافی قریب تر ہے، روح کا ہی نہیں، خدا کا بھی انکاری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا فوق البشر ایک ایسی سفاک ہستی ہے جو کسی اخلاقیات کا پابند نہیں ہے، وہ حق و باطل طے کرنے میں خود مختار ہے اور کسی کو جواب دہ نہیں ہے۔ اس کا مقصد صرف طاقت حاصل کرنا ہے اور اس راہ میں حائل ہر رکاوٹ کو بزورِ طاقت ہٹا دینا ہے۔

اس کے برعکس ہم جب روایتی اسلامی تصوف کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں ہمیں ترکِ دنیا کا سبق ملتا ہے جہاں زیادہ اہمیت انسان کی روح کی ہے اور بدن کو یا دنیا کو کافی حد تک فراموش کر دیا گیا ہے۔[۲] یہی وجہ ہے کہ روایتی تصوف کا بلند ترین مقام فنا فی اللہ ہے جہاں سالک دنیا سے بیزار ہو کر اللہ کی یاد میں خلوت گزین ہو جاتا ہے۔ اور پھر سلوک کی ان منازل کو طے کرنے کے بعد اس کا مقصد اب دوسروں کو بھی اسی سلوک پر چلا کر اس منزل تک پہنچانا ہوتا ہے۔ یہ دونوں انتہائیں انسان کی ماہیت کو کُلّی طور پر نہ سمجھنے کا نتیجہ ہیں۔ علامہ اقبال نے اس کے برعکس اس حقیقت کو واضح کیا کہ انسان روح و بدن کا مجموعہ ہے، اس کو کسی صورت بھی علیحدہ کر کے نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیکھا جاسکتا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''مغرب نے مادے اور روح کی ثنویت کا عقیدہ مانویت کے زیر اثر قبول کرلیا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کے نزدیک ذاتِ انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے' وہ مادے اور روح کی کسی ناقابل اتحاد ثنویت کی قائل نہیں۔ اسلام کی رو سے خدا اور کائنات' روح اور مادہ ایک ہی کُل کے مختلف اجزاء ہیں۔ انسان کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں جس کو اسے ایک روحانی دنیا کی خاطر ترک کردینا چاہیے۔ اسلام کے نزدیک مادہ روح کی اس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قیدِ زمانی و مکانی میں ہوتا ہے۔''(۴)

پھر اسی ضمن میں یہ فرماتے ہیں:

اگر نہ ہو تجھے اُلجھن تو کھول کر کہہ دوں وجودِ حضرتِ انساں' نہ روح ہے' نہ بدن!

اس سے یہ براہِ راست نتیجہ نکلتا ہے کہ اب تعمیر خودی کے لیے جو بھی مقصد متعین ہونا چاہیے وہ بیک وقت دُنیوی بھی ہونا چاہیے اور اُخروی بھی۔ تبھی انسان کی صحیح نہج پر تربیت ہوسکتی ہے اور وہ اپنا اصل مقام پاسکتا ہے۔ چنانچہ اقبال 'اسرارِ خودی' میں اس مقصد کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے پُرزور انداز میں اس کو اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں:

اے ز رازِ زندگی بیگانہ خیز از شرابِ مقصدے مستانہ خیز!

[اے کہ جو رازِ زندگی سے بے خبر ہے' ہمت سے اٹھ' اور کسی مقصد کی شراب سے مستانہ ہو کر اٹھ!]

مقصدے مثلِ سحر تابندہَ ماسویٰ را آتشِ سوزندہَ

[ایسا مقصد جو نورِ سحر کی مانند روشن ہو اور غیر اللہ کو آگ کی طرح جلا کر راکھ کردے۔]

مقصدے از آسماں بالا ترے دل ربائے' دلستانے' دلبرے

[ایسا مقصد جو آسمان سے بھی بلند تر ہو' وہ دلربا بھی ہو' دلستاں بھی اور دلکش بھی۔]

باطلِ دیرینہ را غارت گرے فتنہ در جیبے ، سراپا محشرے

[وہ مقصد جو پرانے نظام باطل کو برباد کرنے والا ہو' اس کی جیب میں فتنے ہوں اور وہ خود سراپا محشر ہو۔]

ما زِ تخلیقِ مقاصد زندہ ایم از شعاعِ آرزو تابندہ ایم!

[ہم تو صرف تخلیقِ مقاصد ہی سے زندہ ہیں اور ہمیشہ آرزو کی شعاع ہی سے روشن ہیں۔]

اس مقصد کی خصوصیات اور پھر علامہ کا انسانِ مطلوب کو رسول اللہ ﷺ کی ذات میں دیکھنا اور ان کا قرآن مجید سے والہانہ لگاؤ' ان سب حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو علامہ کی نظر میں یہ مقصد اللہ کی رضا کی خاطر 'اقامت دین'، اظہارِ دین' یا 'اعلائے کلمۃ اللہ' کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہ سچ ہے کہ علامہ اقبال نے اس مقصد کو بالخصوص اس نام سے تفصیلاً پیش نہیں کیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جب بھی کسی تصور کو عرفِ عام میں پیش کیا جاتا ہے تو اس میں کبھی بھی اس تصور کو پیش کرنے والا مخصوص اصطلاحات استعمال کرنے سے گریز کرتا ہے' کیونکہ ایسا کرنے سے اس تصور کی اہمیت ختم ہوجاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو اس کے طبعی میلانات کو جانتا ہے وہ اس کے تصور میں ان کی جھلک ضرور دیکھ لیتا ہے۔ بہرحال 'اسرارِ خودی' میں ایک ایسا مقام ضرور ہے جس کے عنوان میں علامہ نے اس مقصد کا صریحاً ذکر کیا ہے۔ یہ عنوان اور اس نظم کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

در بیاں ایں که مقصدِحیاتِ مسلم اعلائے کلمة الله است و جهاد اگر محرّکِ اُو جوع الارض باشد در مذهبِ اسلام حرام است

[اس موضوع کے بارے میں کہ مسلمان کی زندگی کا مقصد کلمۃ اللہ کا بلند کرنا ہے اور ایسا جہاد جس کا محرک تسخیرِ ممالک ہو' اسلام کی رو سے حرام ہے۔]

صلح شر گردد چو مقصود است غیر | گر خدا باشد غرض' جنگ است خیر

[اگر خدا کے سوا کچھ اور مقصد ہوگا تو صلح بھی جو بظاہر نیک کام ہے سراسر برائی بن جائے گی اور اگر غرض حق ہو تو جنگ میں بھی جو بظاہر برا کام ہے بلا شبہ خیر کا پہلو ہوتا ہے۔]

گر نہ گردد حق ز تیغ ما بلند | جنگ باشد قوم را نا ارجمند

[اگر ہماری تلوار سے کلمہ حق سربلند نہ ہو تو اس قسم کی جنگ ملت کے لیے بے کار اور بے وقعت ہوگی۔]

پھر علامہ کے بے شمار اشعار ہیں جن سے اس نتیجے کی تائید ہوتی ہے:

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے | نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری | کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار | لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

ان اشعار اور اسی طرح اقبال کے سارے کلام پر غور کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ کے نزدیک وہ بلند ترین مقصد جس پر انسان کی خودی کی تعمیر ہو سکتی ہے' اعلائے کلمۃ اللہ ہی ہے۔ اقبال کے ماخذ یعنی قرآن سے تو یہ حقیقت مزید واضح ہو جاتی ہے۔ سورۃ الصّف کی مندرجہ ذیل آیت میں تو اللہ ربّ العزت خود اپنے رسول ﷺ کی زندگی کا مقصد متعین فرماتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِىٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ۝۹﴾ (الصف)

''وہی (اللہ) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت دے کر اور سچا دین دے کر تا کہ اسے غالب کر دے کُل دین پر چاہے مشرکوں کو کتنا ہی برا لگے۔''

گویا کہ اظہارِ دین ایسا مقصد اور نصب العین ہے جو تعمیرِ خودی کے سلوک کو واضح کرنے کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کے لیے مقرر کیا۔ یقیناً حضور ﷺ کو اس تعمیر کی ضرورت نہ تھی' لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ ان کی سیرت کو قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے اُسوہ بنانا تھا لہٰذا ان کو بھی تعمیرِ خودی کے اس سلوک پر چلنا پڑا۔ عقلی اور منطقی لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو اس سے بلند تر مقصد کوئی نہیں ہو سکتا' کیونکہ یہ بیک وقت مادی اور روحانی دونوں اعتبارات سے اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ مادی و دُنیوی لحاظ سے دیکھا جائے تو سب سے بلند مقصد طاقت اور حکومت کا حصول ہی مانا جاتا ہے' کیونکہ باقی تمام مقاصد اسی کے تابع ہیں۔ شہرت اور مال و دولت حاصل کرنے کے بعد بھی انسان میں طاقت کے حصول کی طلب باقی رہتی ہے۔ ہاں اگر طاقت حاصل ہو جائے تو پھر ایسا شخص اس کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے برعکس روحانی لحاظ سے دیکھا جائے تو سب سے بلند

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقصد دنیا سے بے نیازی ہے' جسے عام طور پر فقر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس نے بھی اس طرف کچھ پیش رفت کی وہ عظیم آدمی کہلایا۔ اب اگر ان دونوں مقاصد کو ملا دیا جائے تو مقصد کچھ اس طرح طے پائے گا کہ طاقت حاصل کرنا اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے نہیں بلکہ اس سے بھی بلند تر مقصد کے لیے' اور یہ اقامت دین ہی ہوسکتا ہے جس کا تقاضا اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اس کے دین کی سربلندی کے لیے طاقت حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا ہے۔ اور اقبال کے نزدیک یہی سچا فقر ہے کہ دنیا کی سب سے محبوب ترین شے یعنی طاقت موجود ہو (یا اس کے لیے کوشش ہو) اور پھر بھی اس سے بے نیاز رہا جائے (یا رہنے کا عزم ہو)۔ کسی کے پاس دُنیوی لحاظ سے بلند ترین مرتبہ نہ ہو تو اس کے بغیر اس کا دعوائے فقر ایک جھوٹا دعویٰ ہی گردانا جائے گا۔ علامہ کا تصورِ فقر اس روایتی تصورِ فقر سے کس قدر مختلف ہے' اسے انہوں نے یوں بیان فرمایا ہے:

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری ! اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری! اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری!
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری میراثِ مسلمانی' سرمایۂ شبیری!

بہر حال جس قسم کا مقصد چنا جائے گا تعمیر بھی اسی نہج پر ہوگی۔ اگر نیٹشے کے مطابق مقصد صرف طاقت حاصل کرنا ہے تو پھر ہٹلر' نپولین' سکندر جیسی شخصیات ہی تشکیل پائیں گی اور اگر مقصد صرف دنیا سے بے نیاز ہو کر یادِ باری تعالیٰ میں محو ہو جانا ہے تو پھر روایتی صوفیاء جیسی ہستیاں ہی تشکیل پائیں گی۔ جبکہ اقبال کا انسانِ مطلوب یعنی انسان کی اصل یا خودی بندۂ مؤمن ہے اور جس کی معراج حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے۔ یہ 'حلقہ یاراں' ہو تو ریشم کی طرح نرم ہوتا ہے لیکن 'رزمِ حق و باطل' ہو تو فولاد بن جاتا ہے' اس کے دل میں دنیا کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود یہ 'جہانگیر'، 'جہاں دار'، 'جہاں بان' اور 'جہاں آرا' ہوتا ہے۔ اور یہ انسانِ مطلوب جس مقصد کے لیے جدوجہد کے نتیجے میں تشکیل پا سکتا ہے وہ مقصد آپ ﷺ کے مقصد کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا جو خود اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے مقرر فرمایا۔

دوسرا مرحلہ: آرزو: مقصد کے تعین کے بعد تعمیر خودی میں اقبال کے نزدیک دوسرا مرحلہ آرزو کا ہے۔ یعنی اس مقصد کو پالینے کی آرزو۔ جس مقصد کو پالینے کی آرزو ہی دل میں نہ ہو تو اس کے حصول کے لیے کوشش کرنے کا جذبہ پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ 'اسرارِ خودی' کے مندرجہ ذیل اشعار میں اقبال مقصد' آرزو اور جستجو کے باہم تعلق کو یوں بیان کرتے ہیں:

زندگانی را بقا از مدعاست کاروانش را درا از مدعاست
[زندگی کی بقاء کسی نہ کسی مدعا سے ہے' اور اس قافلے کے لیے بانگ جرس مدعا ہی ہے۔]
زندگی در جستجو پوشیدہ است اصلِ اُو در آرزو پوشیدہ است
[مستقل قوتِ زندگی جستجو میں پوشیدہ ہے اور اس کی بنیاد آرزو پر رکھی گئی ہے۔]
آرزو را در دلِ خود زندہ دار تا نہ گردد مشت خاکِ تو مزار
[تو آرزو کو اپنے دل میں زندہ اور بیدار رکھ' تا کہ تیری مُشت خاک مزار نہ بن جائے۔]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست　　فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست
[جہانِ رنگ و بو کی روح آرزو ہے اور ہر چیز کی فطرت آرزو کی امانت دار ہے۔]

از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا　　سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا
[سینوں میں دل تمنا ہی سے رقص کرتے ہیں اور تمنا کی روشنی سے سینے مثلِ آئینہ مجلی ہیں۔]

طاقتِ پرواز بخشد خاک را　　خضر باشد موسیٰ ادراک را
[آرزو خاک کو بھی طاقت پرواز عطا کرتی ہے اور وہ کلیم عقل کے لیے مانند خضر رہنمائی کرتی ہے۔]

دل زِ سوزِ آرزو گیرد حیات　　غیرِ حق میرد چو اُو گیرد حیات
[دل سوزِ آرزو ہی سے زندگی حاصل کرتا ہے۔ جب آرزو دل میں زندہ ہوتی ہے تو غیر اللہ فنا ہو جاتا ہے۔]

چوں ز تخلیقِ تمنا باز ماند　　شہپرش بشکست و از پرواز ماند
[جب دل تخلیقِ مقاصد سے محروم ہو جائے' تو سمجھ لو کہ اس کا شہ پر (بازو) ٹوٹ گیا اور وہ محرومِ پرواز ہو گیا۔]

آرزو ہنگامہ آرائے خودی　　موجِ بیتابے زِ دریائے خودی
[آرزو ہی خودی کو عمل کے لیے ہنگامہ آرا کرتی ہے' اور وہ دریائے خودی کی ایک بے چین موج ہے۔]

مقصد کا تعین کر لینے کے بعد اگر چہ اس کے حصول میں بہت سے کٹھن مراحل حائل ہوتے ہیں' اس کو پا لینے کی آرزو ہی وہ محرک جذبہ ہے جو انسان کو عمل پیہم کے لیے ہر دم تیار رکھتا ہے۔ اقبال کے نزدیک ناامیدی خودی کی موت ہے اور یہی پیغمبرِ اسلام ﷺ کی تعلیمات بھی ہیں جنہوں نے ناامیدی کو کفر قرار دیا ہے۔ اقبال خود بھی اس آرزو سے بے قرار رہتے تھے۔ اپنے بارے میں 'پیامِ مشرق' میں لکھتے ہیں:

دلِ من بے قرارِ آرزوے　　درونِ سینۂ من ہاے و ہوے
[میرا دل آرزو سے بے قرار رہتا ہے اور اس سے میرے سینے میں ہاو ہو کا شور بپا رہتا ہے۔]

سخن اے ہم نشیں از من چہ خواہی　　کہ من با خویش دارم گفتگوے
[اے ہم نشین' مجھ سے باتوں کا کیا تقاضا کرتا ہے کہ میں تو اپنے آپ سے مصروفِ گفتگو رہتا ہوں۔]

تیسرا مرحلہ: جہاد: آرزو کے بعد تیسرا مرحلہ مقصد کے حصول کے لیے عمل پیہم یا جہد مسلسل کا ہے۔ یہ وہ طویل مرحلہ ہے جس میں خودی کی صحیح معنوں میں تربیت ہوتی ہے' اور یہی مرحلہ اسلام کا تصورِ جہاد ہے۔ مقصد چاہے کوئی بھی ہو اس کے حصول میں مشکلات اور دشواریاں ضرور ہوتی ہیں اور ان کے خلاف سالک کو جہاد کرنا پڑتا ہے۔ اس دوران ہو سکتا ہے کہ ایسے پُرخطر لمحات آ جائیں جب انسان کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑ جائے' لیکن اس کے باوجود اس سے گریز کی کوئی گنجائش نہیں۔ اقبال کے نزدیک اس مرحلے میں دشواریوں سے تنگ آ کر خودداری پر سمجھوتہ کرنا اور عمل پیہم سے گریز کی روش اختیار کرنا خودی کی موت ہے' چنانچہ اس کے برعکس وہ سالک کو جان دے دینے کی تلقین کرتے ہیں۔ 'اسرارِ خودی' میں فرماتے ہیں:

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات　　لذّتِ تخلیقِ قانونِ حیات
[دراصل زندگی کا راز عمل میں پوشیدہ ہے' اور یہی قانونِ حیات کی تخلیق کا حقیقی لطف ہے۔]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خیز و خلّاقِ جہانِ تازہ شو　　شعلہ در برکن خلیل آوازہ شو

[اب اٹھ اور ہمت سے ایک نئی دنیا کا خالق ہو‘ سینے میں شعلہ عشق اٹھا اور خلیل اللہ کا نعرہ لگا!]

با جہانِ نا مساعد ساختن　　ہست در میداں سپر انداختن

[ایک مخالف اور نا مساعد دنیا سے مغلوب ہو جانا‘ گویا میدانِ جنگ میں ڈھال ہاتھ سے رکھ دینا ہے۔]

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار　　با مزاجِ اُو بسازَد روزگار

[ایسا انسان جو خوددار بھی ہے اور پختہ کار بھی‘ دنیا ضرور اس کی معاون اور مددگار ہوتی ہے۔]

گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں　　می شود جنگ آزما با آسماں

[اور اگر دنیا اس کے مزاج و پسند کا ساتھ نہ دے‘ تو وہ آسمان تقدیر سے جنگ آزما ہوتا ہے۔]

برکند بنیادِ موجودات را　　می دہد ترکیبِ نو ذرّات را

[وہ موجودات کو اس کی جڑ سے اکھیڑ پھینکتا ہے‘ اور ذرات کو نئی ترتیب دے کر نئی دنیا تعمیر کرتا ہے۔]

گردشِ ایام را برہم زند!　　چرخِ نیلی فام را برہم زند!

[وہ گردشِ ایام کو درہم برہم کر دیتا ہے اور چرخ نیلی فام کا بھی شیرازہ بکھیر دیتا ہے۔]

می کند از قوتِ خود آشکار　　روزگارِ نو کہ باشد سازگار

[وہ اپنی قوتِ تسخیر سے ایک نئی دنیا بنا تا ہے‘ وہ دنیا جو اس کے حسبِ منشا و سازگار ہو۔]

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست　　ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

[اگر دنیا میں جواں مردوں کی طرح زندہ نہیں رہا جا سکتا‘ تو پھر بہادروں کی طرح جان قربان کرنا ہی زندگی ہے۔]

مندرجہ بالا اشعار میں علامہ اقبال کا نظریہ تقدیر بھی وضاحت کے ساتھ آ گیا ہے‘ جس کی اصلاح کیے بغیر خودی کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ جو شخص اپنی کم ہمتی اور ناسازگار حالات کو تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر بیٹھ جائے تو وہ تعمیر خودی کے اس سلوک پر نہیں چل سکتا۔ اس کے برعکس اس راہ میں کامیاب وہی ہو گا جو تقدیر سے بھی جنگ آزما ہو جائے۔ اس بنا پر شاید کوئی اقبال کو ’قدریہ‘ جان لے۔ لیکن اقبال قدریہ کی طرح یہ نظریہ نہیں رکھتے تھے کہ تقدیر ہمیں پابند کر ہی نہیں سکتی‘ بلکہ ان کا اس ضمن میں نظریہ یہ ہے کہ ہم تقدیر کے پابند نہیں بلکہ اللہ کے احکامات کے پابند ہیں۔ ہاں تقدیر نے ہر حال میں ہمیں پابند کر کے رہنا ہے۔ اس ضمن میں ان کا مندرجہ ذیل شعر بہت خوبصورت ہے:

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات　　مؤمن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند!

چنانچہ تقدیر کی پابندی کرنا جانوروں اور پودوں کا کام ہے‘ کیونکہ ان کے پاس کوئی اختیار ہی نہیں۔ لیکن انسانوں کا معاملہ یہ نہیں‘ ان کو اختیار دیا گیا ہے کہ ’’اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا‘‘ چنانچہ تقدیر کا فیصلہ ہو یا اللہ کی نازل کردہ شریعت کا فیصلہ‘ ہیں دونوں اللہ ہی کے فیصلے‘ مگر ہم مکلّف شریعتِ الٰہی کے ہیں‘ تقدیرِ الٰہی کے نہیں۔ ہم تقدیر کے فیصلے کو اسی وقت تسلیم کریں گے جب یہ شریعت کے حکم کے موافق ہو گا‘ ورنہ اللہ کے حکمِ شریعت سے حکمِ قدر کے خلاف لڑنے میں ہی ہماری اُخروی نجات ہے۔ علامہ اقبال اپنی مشہور نظم ’پیر و مرید‘ میں اپنے پیر مولانا رومی سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب جہاد کے بارے میں سوال پوچھتے ہیں تو ان کا جواب اسی مسئلے کی وضاحت میں اس طرح آتا ہے:

اے نگہ تیری مرے دل کی کشاد کھول مجھ پر نکتۂ حکمِ جہاد!

نقشِ حق را ہم بہ امرِ حق شکن بر زُجاجِ دوست سنگِ دوست زن!

[نقشِ حق (خدا) کو امرِ حق (خدا) سے توڑ دو‘ دوست کے آئینے کو دوست کے پتھر سے توڑ دو۔]

علامہ اس مرحلے میں ہمت اور عزم کا درس دیتے ہیں‘ کیونکہ اس مرحلے کو پار کرنا ان صفات کے بغیر ممکن نہیں۔

مثلِ حیواں خوردن آسودن چہ سود؟ گر بخود محکم نہ ُبودن چہ سود؟

[حیوانوں کی مانند محض کھانے اور آرام کر لینے کا کیا فائدہ؟ اور اگر تو اپنے آپ میں توانا نہیں تو زندگی کا کیا فائدہ؟]

خویش را چوں از خودی محکم کنی تو اگر خواہی جہاں برہم کنی

[جب تو اپنے آپ کو خودی سے محکم اور توانا کر لے‘ پھر اگر تو چاہے تو تمام دنیا درہم برہم کر سکتا ہے۔)

گر فنا خواہی زِخود آزاد شو گر بقا خواہی بخود آباد شو!

[اگر تو فنا (فنا فی اللہ۔ اشارہ ہے روایتی صوفیاء کے مقصد کی طرف) چاہتا ہے تو اپنے آپ سے آزاد ہو جا‘ لیکن اگر تو بقا (بقاء باللہ۔ اشارہ ہے شیخ احمد سرہندی کی تجدیدی مساعی کی طرف کہ انہوں نے روایتی صوفیاء کے نظریے کی اصلاح کی اور ان میں جذبہ جہاد پیدا کر دیا) چاہتا ہے تو اپنے آپ کو خوب پہچان لے!]

چیست مُردن از خودی غافل شدن تو چہ پنداری فراقِ جان و تن؟

[موت کیا چیز ہے؟ خودی کی ممکنات سے غافل ہو جانا‘ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ موت فراقِ جان وتن کا نام ہے؟]

تربیتِ خودی کے ضمن میں جو مراحل اجمال کے ساتھ ’اسرارِ خودی‘ میں علامہ نے بیان کیے ہیں‘ اس کا پہلا مرحلہ اطاعت بھی اسی مرحلہ جہاد کا ایک حصہ ہے۔ کیونکہ عمل پیہم و جہد مسلسل کسی نظم کے تحت ہی ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں علامہ نے بہت خوبصورت مثالیں دی ہیں۔ چنانچہ تربیت خودی کے پہلے مرحلے یعنی اطاعت کے بارے میں فرماتے ہیں:

سبزہ بر دینِ نمو روئیدہ است پائمال از ترکِ آں گردیدہ است

[سبزہ بڑھنے پھولنے کے نظام کے تحت اُگتا ہے‘ اگر وہ اس نظام سے پہلو تہی کرے تو وہ پاؤں کے نیچے روندا جاتا ہے۔]

لالہ پیہم سوختن قانونِ او بر جُہد اندر رگِ او خونِ او

[لالہ کا آئین و دستور مسلسل جلتے رہنا ہے (سرخ رنگ کی طرف اشارہ ہے) اس کی رگوں میں اس کا خون دوڑتا رہتا ہے۔]

قطرہ ہا دریاست از آئینِ وصل ذرہ ہا صحراست از آئینِ وصل

[باہم مل جانے کے بنا پر قطرے دریا کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ اسی باہمی ملاپ کے دستور کے سبب ذرے صحرا بن جاتے ہیں۔]

باطنِ ہر شے ز آئینے قوی تو چرا غافل ز ایں ساماں روی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

[ہر چیز کا باطن کسی نہ کسی آئین کی وجہ سے مضبوط اور مستحکم بنتا ہے (تو پھر) تو نے کس لیے اس پابندی اور فرماں برداری کو پس پشت ڈال رکھا ہے؟ کیوں غفلت برت رہا ہے؟]

چوتھا مرحلہ: علم وعمل: مقصد کے صحیح تعین کے بعد اس کو پالینے کی آرزو یقیناً سالک کو اس کے لیے جستجو کرنے پر آمادہ کر لیتی ہے' لیکن اس کٹھن سفر میں جو مشکلات ومصائب حائل ہوتے ہیں ان کو پار کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر بھی کچھ درکار رہوتا ہے' اور وہ علامہ کے نزدیک یقین محکم ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اس یقین کے حصول کے ذرائع اقبال کے نزدیک دو ہیں' ایک علم اور دوسرا عشق۔ ان کو اقبال عقل اور جنون سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ علامہ کے نزدیک علم وعقل صرف ایک حد تک ہی یقین کی منزل تک پہنچا سکتے ہیں' لیکن یہ اصل میں عشق وجنون ہیں جو سالک کو اس کی منزل کے بلند درجوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ علم وعقل اور عشق وجنون کا تعمیر خودی کے ساتھ کیا تعلق ہے' اس کی وضاحت کے لیے علامہ کا مندرجہ ذیل شعر بہت اہم ہے:

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل!

[علم سے 'غیرتِ جبریل' تو حاصل کی جا سکتی لیکن مقصد کے حصول کے لیے اس راہ میں حائل رکاوٹوں کو 'صورِ اسرافیل' کے بغیر ہٹانا ممکن نہیں۔]

اسی طرح ایک جگہ عقل کو اسی سلوک میں ایک چراغِ راہ کی حیثیت دیتے ہیں:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے' منزل نہیں ہے!

چنانچہ مقصد کو پالینے کی آرزو کے ساتھ ساتھ سالک کو علم' عقل یا فکر کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ وہ اس سلوک کی حقانیت کے بارے میں ابتدائی مراحل میں انشراحِ صدر حاصل کر سکے۔ اگر کوئی کسی سلوک سے پوری طرح مطمئن ہی نہ ہو تو اس سلوک کے مقصد کو اپنا مقصد بنانے اور اس کے حاصل کرنے کی آرزو اور تمنا رکھنے کے باوجود بھی اس راہ میں زیادہ آگے نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ علم وفکر کو اس جستجو میں چراغِ راہ گردانتے ہیں۔

پانچواں مرحلہ: عشق وجنون: جب سالک کو علم کے ذریعے مقصد کو پالینے کا کچھ یقین حاصل ہو جاتا ہے تو وہ رفتہ رفتہ اس راہ پر تندہی سے پیش رفت کرتا چلا جاتا ہے' یہاں تک کہ یہ کیفیت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ دیوانہ وار اس کے حصول کے لیے گامزن ہو جاتا ہے۔ یہی دراصل مقامِ عشق ہے۔ یہ عشق اقبال کے نزدیک ایک بہت بڑی طاقت ہے جو بہت تیزی سے تعمیر خودی کے مراحل پار کرا دیتی ہے۔ چنانچہ اقبال کے نزدیک علم وعقل کے ذریعے حاصل کردہ یقین کے نتیجے میں سالک پر اپنا مقام واضح تو ہو جاتا ہے' لیکن یہ عشق ہی ہے جو اسے اس مقام پر پہنچا سکتا ہے۔

عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں!

یہی مقصد کا عشق ہے جو بعد میں عشقِ الٰہی بن جاتا ہے۔ اصل میں محبوب سے عشق کا تقاضا ہی یہ ہوتا ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے میں اپنا سب کچھ کھپا دیا جائے' جس میں اس کی خوشی ورضا ہو' ورنہ تو عشق کی حیثیت ایک دعوے کے سوا کچھ نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اقبال کا تصورِ عشق روایتی صوفیاء کے تصورِ عشق سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہت مختلف ہے‘ جس میں محبوبِ حقیقی سے الحاق ہی اصل مقصد ہوتا ہے‘ جب کہ وہ امر جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہے اس کی طرف توجہ نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں کہ انہیں ان لوگوں سے محبت ہے جو اس کی راہ میں باہم مربوط ہو کر اس کے اور اس کے دین کے دشمنوں سے جنگ کرتے ہیں‘ جبکہ روایتی صوفیاء خلوت گزینی‘ اور ترکِ دنیا میں ہی اللہ کی رضا ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾ (الصّف)

’’بیشک اللہ کو تو محبت ہے ان سے جو اُس کی راہ میں صفیں باندھ کر قتال کرتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔‘‘

اس کے بعد یہی مقصد کا عشق سالک پر رسول اکرم ﷺ کی عظمت بھی منکشف کر دیتا ہے‘ کیونکہ جب وہ اس راستے پر خود چل رہا ہوتا ہے اور وہ مشکلات اور مصائب جو رسول اللہ ﷺ نے جھیلی تھیں اس کو براہ راست سہتا ہے‘ اس کا حضور اکرم ﷺ کی شخصیت کے ساتھ ایک گہرا رشتہ استوار ہو جاتا ہے‘ جس کا نام عشقِ رسول ﷺ ہے۔ جس شخص نے اس راستے پر چل کر وہ سب مصائب اور مشکلات کا اندازہ ہی نہیں کیا جو رسولِ اکرم ﷺ نے سہے ہیں اس پر حضور ﷺ کا مقام اور مرتبہ کیسے منکشف ہو سکتا ہے اور اس کے عشقِ رسول کے دعوے کس حد تک صحیح ہو سکتے ہیں؟ چنانچہ عشقِ رسولؐ سالک کے اندر اتباعِ رسولؐ کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے اور پھر سالک کا تعلق روحانی طور پر رسول اکرم ﷺ سے استوار ہو جاتا ہے جو اقبال کے انسانِ مطلوب ہیں۔ اقبال اپنے بارے میں فرماتے ہیں:

وہ دانائے سبل‘ ختم الرسل‘ مولائے کل جس کے ۔۔۔ غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا!

اسی طرح رسول اکرم ﷺ کی ذات کو ہی دین حق کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں:

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ۔۔۔ اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است!

[تو خود کو محمد ﷺ کے دربار میں پہنچادے‘ کیونکہ دین حق وہی ہے۔ اگر تو آپ ﷺ کا مسلک اختیار نہ کر سکا تو سمجھ لے کہ باقی سب کفر ہے۔]

عشق جیسا کہ بیان ہوا ایک بہت اہم منزل ہے۔ جو سالک عشق سے سرشار ہو جاتا ہے اس کے نزدیک اس دنیا کی کوئی حیثیت نہیں رہتی‘ بس اسے صرف اللہ کی رضا محبوب ہو جاتی ہے اور وہ اس مقصد کی خاطر جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا ہو‘ اپنا سب کچھ لگانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ یہ عاشق پھر فرعون و نمرود جیسے سفّاک حکمرانوں سے بھی نہیں ڈرتا‘ حق گوئی اور بے باکی اس کا شعار بن جاتے ہیں‘ یہاں تک کہ موت بھی اس کے سامنے ہیچ ہو جاتی ہے۔ اللہ کی رضا کی خاطر خطروں سے کھیلنا اس کی عادت بن جاتی ہے۔ غرضیکہ عشق وہ مرحلہ ہے کہ جب سالک اسے عبور کر لیتا ہے تو اسے فقر‘ دلیری‘ خودداری‘ بے باکی‘ فراست جیسی صفات حاصل ہو جاتی ہیں۔ علامہ ان خصوصیات کو اپنے کلام ’بالِ جبریل‘ میں ایک جگہ یوں بیان کرتے ہیں:

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی ۔۔۔ کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی
عطار ہو‘ رومی ہو‘ رازی ہو‘ غزالی ہو ۔۔۔ کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی
نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ ۔۔۔ کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی ۔۔۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ ۔۔۔ ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی ۔۔۔ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مرحلہ عشق اس سلوک کا ایک بہت اہم مرحلہ ہے جس کے بے حد مقامات ہیں۔ عشق کے ان مقامات کے بارے میں علامہ فرماتے ہیں:

عشق فقیہہِ حرم‘ عشق امیرِ جنود ۔۔۔ عشق ہے ابن السبیل‘ اس کے ہزاروں مقام!

علامہ کے نزدیک یہ عشق اسی طرح سالک کو دیوانہ وار عمل پر گامزن رکھتا ہے‘ یہاں تک کہ خودی ایسا مقام حاصل کر لیتی ہے کہ وہ مر کر بھی نہیں مرتی اور اپنی حیات جاری رکھتی ہے‘ یعنی آنے والا زمانہ بھی اس کے فیض سے فیضیاب ہوتا رہتا ہے۔

مردِ خدا کا عمل‘ عشق سے صاحبِ فروغ ۔۔۔ عشق ہے اصلِ حیات‘ موت ہے اس پر حرام

اس شعر میں ایک بات توجہ طلب ہے کہ یہاں اقبال نے مردِ مؤمن کی بجائے مردِ خدا کا ذکر کیا ہے۔ اقبال کا انسانِ مطلوب تو مردِ مؤمن ہے‘ لیکن جس شخص نے بھی دنیا میں کوئی عظیم کارنامہ سرانجام دیا اقبال اس کو بھی ''عِبَادًا لَّنَا'' (بنی اسرائیل:۵) کی روشنی میں مردِ خدا کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عشق چاہے کسی بھی مقصد کے ساتھ ہو مرتا نہیں ہے بلکہ اپنے اثرات دکھاتا رہتا ہے۔

چھٹا مرحلہ: یقین: انسان جتنا عشق کے بحرِ بیکراں کو عبور کرتا ہے اتنا ہی اسے اپنے مقصد کے پا لینے کا یقین نصیب ہو جاتا ہے۔ اس یقین کے پیدا ہونے کی وجہ فطرتِ حیاتِ انسانی ہے۔ جیسا کہ پہلے اشعار میں بیان ہوا مسلسل عمل پیرا رہنا زندگی کی حقیقت ہے‘ جب سالک اپنے مقصد کی طرف جدوجہد پر دیوانہ وار گامزن ہو جاتا ہے اور اس راہ میں مشکلات اور مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے تو اس جُہدِ مسلسل میں اسے اپنی زندگی کا احساس ہوتا ہے‘ اور اس کو ترک کر دینے کے تصور سے ہی اسے نفرت ہو جاتی ہے کیونکہ اس صورت میں اسے اپنے اسی احساسِ زندگی کی موت نظر آ رہی ہوتی ہے۔ اس لیے جیسے جیسے وہ اس جدوجہد میں آگے بڑھتا رہتا ہے‘ اسے اس بات کا یقین ہونے لگتا ہے کہ یہی حق ہے‘ اور اگر اس کا مقصد عقلاً اور فطرتاً صحیح ہو تو یہی یقین محکم کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اگر سالک اس مقام تک پہنچ جائے تو اس میں عزمِ مصمّم‘ ثابت قدمی‘ استقامت‘ جواں مردی اور ضبطِ نفس جیسی اعلیٰ صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اقبال ایسا ہی یقین پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ عمل پیہم اور یقین کے باہم تعلق کو علامہ یوں واضح کرتے ہیں:

دمادم خویش را اندر کمیں باش ۔۔۔ گریزاں از گماں سوئے یقیں باش

[تو ہر وقت اپنی خودی کی تحقیق اور حفاظت میں رہ‘ اور شک وشبہ کو چھوڑ کر یقین کی طرف بھاگ!]

عمل خواہی؟ یقیں را پختہ تر کن ۔۔۔ یکے جوے و یکے بین و یکے باش!

[لیکن جب عمل چاہیے تو یقین کو نہایت پختہ کر‘ ایک ہی نصب العین کی جستجو کر‘ اسی کو دیکھ اور اسی میں وقف ہو جا!]

اسی طرح علامہ کے کلام میں اس موضوع پر بے شمار اشعار ملتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو' زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے!
گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی!
یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں' نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
یقیں محکم' عمل پیہم' محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

یہی وہ مقام ہے جس میں علامہ کا پیش کردہ تربیتِ خودی کا دوسرا مرحلہ یعنی ضبطِ نفس بھی پار ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک اس مرحلے میں سب سے بڑی رکاوٹیں خوف اور محبت ہیں۔ یعنی دنیا' آخرت' جان اور آسمانی آفتوں کا خوف اور مال و دولت' وطن' عزیز و اقارب اور عورت کی محبت۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

طرحِ تعمیرِ تو از گِل ریختند
با محبت خوف را آمیختند

[تیرے وجود کی تعمیر مٹی سے ہوئی ہے۔ یعنی تو آب و گل سے بنا ہے۔ اس تعمیر میں محبت اور خوف کی باہم آمیزش کی گئی ہے۔]

خوفِ دُنیا خوفِ عقبیٰ خوفِ جاں
خوفِ آلامِ زمین و آسماں

[دنیا کا خوف ہے' آخرت کا خوف ہے' جان کا خوف ہے' زمین اور آسمان سے نازل ہونے والی آفتوں کا خوف ہے۔]

حُبِّ مال و دولت و حُبِّ وطن
حُبِّ خویش و اقربا و حُبِّ زن

[مال و دولت کی محبت اور وطن کی محبت ہے' اپنے عزیزوں کی محبت اور عورت کی محبت ہے۔]

ان سب کمزوریوں سے نکلنے کے لیے علامہ توحیدِ الٰہی پر یقین کا درس دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

تا عصائے لا الٰہ داری بدست
ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

[جب تک تیرے ہاتھ میں 'لا الٰہ' (کلمہ توحید) کا عصا ہے تو خوف اور ڈر کے ہر طلسم کو توڑ کے رکھ دے گا۔]

ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش
خم نگردد پیشِ باطل گردنش

[جس کسی کے دل میں حق جان کی طرح موجود ہے اس کی گردن کبھی باطل کے سامنے نہیں جھک سکتی۔]

خوف را در سینۂ او راہ نیست
خاطرش مرعوبِ غیر اللہ نیست

[اس کے سینے میں خوف کا گزر ہو ہی نہیں سکتا' اس کا دل خدا کے سوا کسی شے سے نہیں ڈرتا۔]

ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد
فارغ از بندِ زن و اولاد شد

[جو شخص 'لا' یعنی توحید کی مملکت میں آباد ہو گیا وہ بیوی بچوں کی زنجیر سے بالکل آزاد ہو گیا۔]

می کند از ما سوٰی قطعِ نظر
می نہد ساطور بر حلقِ پسر

[وہ غیر اللہ سے نظریں ہٹا لیتا ہے' وہ اپنے بیٹے کے حلق پر چھری رکھ دینے میں بھی پس و پیش نہیں کرتا۔]

با یکی مثلِ ہجومِ لشکر است
جاں بچشمِ او زباد ارزاں تر است

[وہ یکہ و تنہا ہونے کے باوصف ایک بہت بڑے لشکر کی صورت ہے' اس کی نظروں میں اس کی جان ہوا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے بھی کہیں سستی ہے۔]

یہاں بھی ضبطِ نفس کے مرحلے کا حاصل علامہ کے نزدیک ایک نڈر اور بیباک شخص ہے جو خوفِ الٰہی کے سوا ہر قسم کے خوف سے آزاد اور محبت الٰہی کے سوا ہر محبت سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ تعمیرِ خودی کا یہ مرحلہ بھی روایتی صوفیاء کے مرحلۂ ضبطِ نفس سے بہت مختلف ہے‘ جن کا مقصود اس مرحلہ سے نفیِ ذات ہوتا ہے۔ جب کسی کو اس دنیا سے سروکار ہی نہیں‘ تو اس کو اس میں باطل کے ساتھ پنجہ آزمائی کی کیا ضرورت ہے! اور جب وہ اس پنجہ آزمائی کے لیے تیار ہی نہیں‘ تو اس راہ میں گردن کٹانے کا مرحلہ ظاہر ہے نہیں آ سکتا۔ لیکن علامہ کا انسانِ مطلوب اس مرحلے کے بعد تنہا بھی ہو تو باطل سے ٹکر لے لیتا ہے اور اس راہ میں جان دینے سے ذرا دریغ نہیں کرتا۔ عشق کے بحرِ بیکراں کو جو جتنا عبور کر لیتا ہے وہ اتنا ہی محکم یقین پا لیتا ہے۔ اور پھر اسی یقین سے خودی سے آشنائی ہوتی ہے‘ یا دوسرے لفظوں میں وہ اتنا ہی اس مقام پر رسولِ اکرم ﷺ کے قریب تر پہنچ جاتا ہے جو انسانی خودی کی معراج ہیں۔ علامہ کے نزدیک دراصل خودی کا یہ وہ مقام ہے جس کی زد میں زمین‘ آسمان‘ کرسی اور عرش سب کچھ آ جاتے ہیں اور یہی انسان کی حقیقت یعنی نیابت الٰہی ہے:

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی   خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش   خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

ساتواں مرحلہ: نیابتِ الٰہی: یقین کا مرحلہ طے کرتے ہی سالک نیابتِ الٰہی پر فائز ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ بیان ہوا جو جتنا عشق کے مراحل طے کرتا ہے وہ اتنا ہی محکم یقین حاصل کر لیتا ہے۔ اور جتنا یقین مضبوط ہوتا ہے اتنا ہی مقام نیابتِ الٰہی کا شعور حاصل ہوتا ہے۔ نیابت الٰہی ایک بہت بلند مقام ہے‘ یہی انسان کی اصل ہے‘ اسی لیے وہ اس دنیا میں بھیجا گیا ہے اور یہی وجہ تھی کہ اس کو مسجودِ ملائکہ بنایا گیا۔ اس مقام کو ایک سادہ سی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جب ملٹری اکیڈمی میں کیڈٹس کو بھیجا جاتا ہے تو ہر ایک طویل اور مشقت آمیز تربیتی مراحل سے گزرتا ہے۔ جو جتنے اچھے انداز میں ان مراحل سے گزرتا ہے وہ اتنا ہی بلند مقام حاصل کر لیتا ہے۔ ہر مقام و مرحلہ پر اس کے ماتحت کچھ سپاہی کر دیے جاتے ہیں جو اس کے حکم کی تعمیل میں ہر وقت مستعد رہتے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک ایسا بھی ہوتا ہے جو ان مراحل کو اس انداز میں طے کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ساری فوج کا چیف بننے کا مستحق ٹھہرا لیتا ہے‘ جس کے حکم کی تعمیل میں ساری فوج آ جاتی ہے۔ اگرچہ ملٹری اکیڈمی میں بھیجے جانے والے کیڈٹس میں سے ہر ایک اس مقام کو پا لینے کا حق رکھتا ہے‘ لیکن اس کو پا وہی سکتا ہے جو اس کے تقاضے پورے کرنے کے قابل ہو۔ یہی معاملہ نیابتِ الٰہی کا ہے۔ فرشتے اللہ کے کارندے ہیں جو ساری کائنات کے عناصر پر تعینات ہیں۔ چنانچہ کوئی پہاڑوں کا نظام سنبھالے ہوئے ہے تو کوئی دریاؤں اور سمندروں کا‘ علیٰ ہذا القیاس کائنات کے تمام نظامات ان ہی فرشتوں کے ہاتھوں میں ہیں جنہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مطابق چلاتے ہیں۔ ان سب کا اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نائب یعنی انسان کو سجدہ کرنا اس امر کی دلیل تھا کہ اس کا حکم ان سب پر چل سکتا ہے‘ لیکن یہ اسی صورت میں ہو گا جب وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرے گا۔ دنیا ایک اکیڈمی ہے جس میں انسانوں کو بھیجا جاتا ہے۔ ان کی تربیت کا ایک نظام اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل علیہم السلام کے ذریعے سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واضح کر دیا ہے۔ جوان طے شدہ مراحل سے گزرتا ہے اور جتنا بہتر انداز میں گزرتا ہے وہ اتنا ہی اعلیٰ مقام پالیتا ہے اور اتنے ہی زیادہ فرشتے اس کے حکم کی تعمیل میں لگا دیے جاتے ہیں۔ بنی نوع انسان میں سے انبیاء و رسل علیہم السلام ہی وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جو بلند ترین مقامات پر فائز ہوئے' اور ان کے ماتحت بڑے بڑے فرشتے تک کر دیے گئے۔ اور وہ ہستی جو اس مقام کی معراج پر پہنچی حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے کہ جن کو فرشتوں کے سردار جبرائیلؑ بھی رپورٹ کرتے تھے۔ فرشتوں کی ماتحتی کا سب سے بڑا مظہر ان کی نصرت ہے جو اللہ کے اذن سے مشکل حالات میں انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کے سچے متبعین کو ملتی رہی۔ اس بے پناہ طاقت کو وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکام کے نفاذ کے لیے استعمال کرتے ہیں' تا کہ اسے امن کا گہوارا اور جنت فی الارض بنا سکیں۔

علامہ اس حقیقت کو غزوۂ بدر کے تناظر میں بیان کرتے ہیں جب مسلمانوں کو فرشتوں کی نصرت حاصل ہوئی تھی:

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

وہ پہلا موقع جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنی خودی سے باقاعدہ آشنائی حاصل ہوئی وہ غزوۂ بدر کا موقع تھا اور اس کے بعد تو یہ سلسلہ طویل عرصے تک جاری رہا۔ اس غیر معمولی طاقت کو اس مقام پر فائز مردانِ خدا کیسے استعمال کرتے ہیں اس کا ذکر بھی علامہ تربیت خودی کے مرحلہ نیابت الٰہی کی تفصیل میں یوں بیان کرتے ہیں:

خیمہ چوں در وسعتِ عالم زند این بساطِ کہنہ را برہم زند

[جب وہ کائنات کی وسعتوں میں خیمہ لگا لیتا ہے تو اس پرانی بساط کو الٹ کر رکھ دیتا ہے۔]

فطرتش معمور و می خواہد نمود عالمے دیگر بیارد در وجود

[اس کی فطرت برکتوں اور اچھائیوں بھری ہوتی ہے اور اس کا اظہار وہ ایک نئی دنیا کے وجود میں لانے سے کرنا چاہتی ہے۔]

صد جہاں مثلِ جہانِ جزو و کُل روید از کشتِ خیالِ او چو گُل

[اس کائنات جیسے سینکڑوں جہان اس کے خیالات و افکار کی کھیتی سے پھولوں کی طرح اُگتے رہتے ہیں۔]

پختہ سازد فطرتِ ہر خام را از حرم بیروں کند اَصنام را

[وہ خام فطرت کو پختہ اور پائیدار بنا دیتا ہے' وہ حرم سے بتوں کو باہر نکال دیتا ہے۔]

نغمہ زا تارِ دل از مضرابِ او بہرِ حق بیداریٔ او خوابِ او

[اس کے مضراب سے دل کے ساز سے نغمے پھوٹنے لگتے ہیں۔ اس کا جاگنا اور اس کا سونا سب اللہ کے لیے ہوتا ہے۔]

شیب را آموزد آہنگِ شباب می دہد ہر چیز را رنگِ شباب

[وہ بڑھاپے کو جوانی کی لے سکھا دیتا ہے' وہ ہر چیز کو شباب کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔]

نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر

[وہ بنی نوعِ انسان کے لیے خوشخبری دینے والا بھی ہے اور اسے برائی سے ڈرانے والا بھی' وہ سپاہی بھی ہوتا ہے' وہ فوج کا سپہ سالار بھی ہے اور سردار بھی۔]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سلوکِ تعمیرِ خودی اور قرآن

تعمیرِ خودی کے ان مراحل میں علامہ ذکر وفکر کا سرچشمہ قرآن ہی کو قرار دیتے ہیں اور جیسا کہ پہلے بیان ہوا یہی ان کے فکر وفلسفہ کا ماخذ بھی ہے۔ چنانچہ اپنے انسانِ مطلوب یعنی بندۂ مؤمن کے بارے میں فرماتے ہیں:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مؤمن　　　قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن!

کردار میں جدت پیدا کرنے کے لیے بھی وہ قرآن میں تفکر کی دعوت دیتے ہیں:

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں　　　اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

اسی طرح قرآن کو اپنے اندر اتارنے کی تلقین کرتے ہیں، کیونکہ اس میں وہ تاثیر ہے جو انسان کو تبدیل کر کے رکھ دیتی ہے، اور جب وہ تبدیل ہو جاتا ہے تو سارا جہان ہی تبدیل ہو جاتا ہے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود　　　جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اسی طرح نوجوان نسل کو قرآن خواں کی بجائے صاحب قرآن بننے کی تلقین کرتے ہیں:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے　　　کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں!

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو　　　کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں!

تعمیرِ خودی کا یہ سلسلہ محض ایک فرد تک محدود نہیں رہتا بلکہ یہ فرد سے اجتماعیت کی طرف رخ کرتا ہے اور پھر اس اجتماعی خودی کی تعمیر کا بھی سامان فراہم کر دیتا ہے۔ یہ علامہ کا ایک اور غیر معمولی تصور ہے جسے انہوں نے 'بےخودی' سے تعبیر کیا ہے اور جس کو تفصیل سے انہوں نے 'رموزِ بےخودی' میں واضح کیا ہے۔ اس پر ان شاء اللہ اگلی قسط میں تفصیلی بات ہوگی۔

حواشی

(۱) ڈاکٹر رفیع الدین، حکمتِ اقبال، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد، ص ۵۷، ۵۸۔ ''فلسفہ خودی کائنات کا آخری فلسفہ ہے۔''

(۲) یہاں صحیح اسلامی تصوف پر تنقید کرنا مقصود نہیں بلکہ اس روایتی تصوف کے منفی اثرات کا ذکر کرنا مقصود ہے جس کے ڈانڈے اصلاً فکرِ یونان سے ملتے ہیں اور جس کا مقصد سالکین کو حقیقی دنیا کے مسائل سے بے پروا کر کے محض ترکِ دنیا کا سبق دینا ہے۔

(۳) علامہ اقبال، آل انڈیا مسلم لیگ کا پچیسواں اجلاس، ۲۹ تا ۳۰ دسمبر ۱۹۳۰ء، الٰہ آباد۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

© rasailojaraid.com